ڈاکٹر بشریٰ پروین

استاد شعبہ اردو،

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز ،اسلام آباد

پاکستانی جدید ادب کے عکاس دو ناول: خوشیوں کا باغ اور دیوار کے پیچھے

Dr. Bushra Parveen

Assistant Professor, Urdu Department,

National University of Modern Languages, Islamabad.

Two Novels Reflection of Pakistani Modern Literature:

Khushiyon Ka Bagh & Deewar Kay Peechay

Culture of society its literary style. It includes life style, customs, economics, arts and knowledge etc of a particular era. The word "Culture" has its roots in a German word "Katos" which means plughing, sowing and growing, Sometimes, the culture of a certain area crosses its boundaries and affects other areas and it affects literature also of that area. The Urdu novel has also adapted itself to the cultural changes which have gradually come into this part of the world, which resulted in a variety of colorful cultural aspects in the urdu novel.

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں برصغیر میں جو سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں ان حالات نے تحریر اور تقریر میں بھی نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔اس کے علاوہ اردو ادب، مغربی ادب و فکر سے بھی متاثر ہوا۔صحافت، شاعری، مضمون نگاری، ناول نگاری اور خاص طور پر افسانہ نگاری پر مغربی ادب کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ادب چونکہ زندگی کو موضوع بناتا ہے اس لیے معاشرے میں رونما ہونے والے تمام عناصر ادبی تخلیقات سے منعکس ہوتے ہیں۔حقیقت نگاری کے اس دور میں عوام تبدیلی کے خواہاں تھے اور اس کے ساتھ اپنی طرف دیکھنے کی جرأت بھی کر رہے تھے۔اس طرح ہندوستان میں جو تحریکیں پیدا ہوئیں ان میں کچلے ہوئے عوام کی طرف زیادہ توجہ دی

گئی۔ کچلا ہوا نچلا طبقہ عمومی طور پر تخلیقات کا موضوع بن گیا۔ جن ادیبوں نے جرأت اور بہادری سے ان موضوعات پر لکھا اور اور حکومتی پالیسیوں پر نقطہ چینی کی، ان میں سب سے زیادہ اہم نام منشی پریم چند کا ہے۔ منشی پریم چند نے غربت اور افلاس میں بچپن گزارا۔ وہ دیہی زندگی اور غریب لوگوں کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ پہلے افسانوں اور پھر اپنے ناولوں میں انھوں نے نہایت بے باکی سے ان موضوعات پر بات کی۔

بیسویں صدی کے آغاز پر کئی طرح کے انقلابات سامنے آئے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم، روس کا اشتراکی انقلاب، صنعتی اور سائنسی انقلاب، برصغیر میں تاج برتانیہ کے خلاف آزادی کی تحریکیں، جدید علوم کا حصول اور نیا سماجی ماحول عوام میں شعور پیدا کرنے لگا۔ ایسے میں ادب اور ادیب دونوں متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے؟ عتیق احمد کے مطابق:

> شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب کی آخری سرحدوں تک سیاسی جدوجہد، آزادی کے نعروں اور انقلابی تحریکوں کی گونج نے فاقہ کشی اور سسکتی بلکتی زندگی کو کچھ دن گزارنے کی سرشاری سے بھر دیا۔ ادب کا سرچشمہ زندگی ٹھہر چکا تھا۔ ادبی اظہار اور ابلاغ میں بھی یہی والہانہ پن اور سرفروشی آگئی۔ خامیاں اور بھول چوک کہاں نہیں ہوتیں مگر اس ادبی دور نے اپنی خامیوں کے باجود ہمارے ادبی سرمائے میں ایسے ایسے اضافے کیے ہیں جن کی گونج بہت دیر اور بہت دور تک ہماری نسل کو دعوت گوش ہوش دیتی رہے گی۔(۱)

چنانچہ ادیب اور مصنفین اپنے اپنے خیالات اور نظریات کو قلم اور کاغذ کے سپرد کرنے لگے۔ سامراج کے خلاف جن ادیبوں نے اپنے جذبات کا برملا اظہار کیا ان میں پریم چند سرفہرست ہیں۔ ان کی کہانیاں اپنے دور کی بہترین عکاس ہیں۔ علامہ اقبال انگریز حکومت کے خلاف ایک نیا شعری منظر نامہ لکھ رہے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ''انگارے'' کی اشاعت سے ایک نئی جہت کا آغاز ہوا۔ اس کو ڈاکٹر رشید جہاں اور احمد علی نے مرتب کیا تھا۔ یہ مجموعہ بھی باغیانہ خیالات پر مبنی تھا لیکن جو تحریک اردو ادب میں سب سے بڑی تبدیلی کا سبب بنی وہ ترقی پسند تحریک تھی جس کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ اس تحریک کے ذریعے اردو ادب کو ایک نئی فکر اور نیا شعور ملا۔ ترقی پسند، کارل مارکس کے سماجی انصاف کے نظریے کے حامی تھے۔ یہ لوگ سماجی بے انصافی اور طبقاتی تقسیم کے بھی خلاف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عام آدمی کی زندگی ان کا موضوع بن گئی۔ عام آدمی کا غم اور دکھ ادب کی زینت بن گیا۔

اس دور میں بھی مغربی ادب کے تراجم بھی ہوئے۔ ادب کو زندگی کہا گیا تو حقیقت نگاری کی ایک نئی روایت نے جنم لیا جس کے ذریعے روزمرہ زندگی کے مسائل ادب کا موضوع بنے۔ سیاسی پیچیدگیاں، معاشی دشواریاں، معاشرتی مسائل، تعلیم یافتہ طبقے کی بدحالی بھی ادب کا حصہ بن گئی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں:

> ہم جن مصائب میں گرفتار تھے ان کے متعلق سوچنا اب ہر ادیب کا فرض اولین تھا۔ زمانہ کی ارتقائی اور انقلابی دھارے کچھ اس طرح مل گئے کہ ان کے امتزاج سے ترقی پسند کی تخلیق ناگریز ہوگئی۔ ٹھوس زندگی اپنی پوری تلخیوں کے ساتھ ہمارے پیش نظر تھی۔ ہمارے واسطے ناممکن تھا کہ زندگی سے فرار ہوسکیں۔(۲)

وقت کی تبدیلی نے ذہنوں، خاص طور پر نوجوان ذہنوں کو متاثر کیا۔ روسی ادب نے اردو ادب میں نیا رنگ اور نئی روح پھونک دی۔ سائنسی ترقی نے جہاں انسان کو آسانیاں فراہم کیں وہیں مسائل میں بھی الجھا دیا۔ حالات تیزی سے رنگ بدلتے ہیں۔ عالمی اور ملکی حالات کے پیشِ نظر بیشتر ممالک کے ادیبوں نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ان مسائل پر قلم اٹھانے کی ٹھان لی اور اس سلسلے میں مصنفین کی ایک عالمی کانفرنس فرانس کے شہر پیرس کے مشہور ہال ''بال بولیے'' میں منعقد ہوئی۔ یہ وہ پہلی کانفرنس تھی جس میں دنیا کے تمام بڑے مصنفین نے شرکت کی۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی کے مطابق:

> اس کانفرنس میں پہلی بار قریب قریب پوری دنیا کے ادیب ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ ان سب کو ایک جگہ جمع کرنے والے ادیبوں میں میکسم گورکی، آندرے مارلو، ٹامس مان، رومین رولاں جیسی ہستیاں شامل تھیں۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ انسانی زندگی کی تہذیب و تمدن کو رجعت پسندی اور مائل بہ زوال ہونے سے بچانے کے لیے ادیب اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے ترقی اور فلاح کے راستے تلاش کریں (۳)

یہ تمام ادیب اس بات پر متفق تھے کہ آزادیِ اظہار ایک ضروری عمل ہے جس کے بغیر ادب اور ادیب دونوں بے کار ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ حالات تھے جن کی بدولت ترقی پسندی کی ابتدا ہوئی۔ اس دور میں ''انگارے'' بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ سرسید تحریک کا مقصد ایک ایسے طبقے کی فلاح اور اس کی استحصالی طبقے سے آزادی تھی جس کے ہاتھ دولت پیدا کرنے کے لیے محنت کرتے تھے۔ اس طبقے کی محنت کے باعث ملکی انتظام چلتا ہے۔ ترقی پسند، اقتصادی نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ وہ پسے ہوئے طبقے کو عزت اور وقار دلانے کے خواہش مند تھے۔ ترقی پسند ادیب انسانیت سے محبت اور ہمدردی کا دعویدار ہے۔ ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کا پہلا اجلاس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوا جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔

جدید ادب کا تعلق براہ راست زندگی اور معاشرتی حالات سے ہے اور اس کی جڑیں سرسید تحریک میں پیوستہ ہیں۔ سرسید تحریک میں شامل ادیبوں نے ادب کو وسیلہ بناتے ہوئے سماجی برائیوں کو موضوع بنایا تھا۔ ترقی پسند تحریک نے اس میں وسعت پیدا کر دی۔

محمد اشرف چوہدری اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> کسی دور کا اس کے مفکروں پر کیا اثر پڑتا ہے یہ ایک الگ موضوع ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ منفرد رجحانات اور تقاضے عموماً اپنے دور کے ادیبوں کی سوچ اور فکر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ذہنی ارتقاء یا انحطاط اقتصادی مشکلات یا آسودگی، اخلاقی اور روحانی دیوالیہ پن، جنگ اور امن، سیاست اور مذہب سب ہی تو مفکروں کی سوچ کا دھارا بدل دیتے ہیں اور ان شہ پاروں میں بھرپور اظہار پاتے ہیں۔ (۴)

ادب میں زندگی کی عکاسی جدید ادب کی روح ہے۔ انسانی فکر، درد، ماحول، معاشرہ اور ذات ایک ادیب کی تخلیق کو ضرور متاثر کرتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ موقع بے موقع روک ٹوک انسان کے اندر اور زیادہ تجسس اور

بغاوت کے رویے کو ہوا دیتی ہے۔اس دور کے ادیب نے حقائق سے روگردانی کے بجائے مقابلے اور مسائل کی نشاندہی کی ٹھانی تو اس وقت اس کی صاف گوئی اور حقیقت پسندانہ رویے کو حکومت دشمنی قرار دیا گیا۔لیکن ادیب تو اپنے معاشرے کی سوچ اور اظہار کا نمائندہ ہوتا ہے۔ترقی پسند ادب کی مخالفت میں اسلامی ادب اور پاکستانی ادب کی بنیاد بھی ڈالی گئی بوجوہ یہ دونوں تحریکیں کامیاب نہ ہوسکیں اور ادیبوں کی اکثریت ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہی۔اِن ادیبوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے معاشرے کی بے انصافیوں اور استحصال کو خوب نشانہ بنایا اور تعریفیں کم مخالفتیں اور مصیبتیں زیادہ برداشت کیں۔اس سلسلے میں عتیق احمد کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> بات دراصل یہ ہے کہ لکھنے والا تو ہر دور اور ہر عہد کی ایک صدائے احتجاج ہوتا ہے۔احتجاج مسلسل کے نقوش اس کی تحریریں ہوتی ہیں جسے ادب کہا جاتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ اسے اس احتجاج کا حق یوں بھی پہنچتا ہے کہ وہ اپنے کمال ریاض سے اپنے عصر حاضر کے عوامی ذہن سے آگے بات سوچتا ہے، دیکھتا ہے اور لکھتا ہے یہ کچھ وہ حق صداقت نگاری ہے جو ادیب کی متاع گل ہوتی ہے۔(۵)

پاکستان بننے کے بعد صنعتی دور کا آغاز ہوا۔شہر پھیلنے لگے عوام کے معاشی مسائل میں اضافہ ہوا۔فرد مشینوں کے شکنجے میں جکڑا جانے لگا۔اس دور میں فرد اپنی شناخت سے محروم ہونے لگا کچھ حساس افراد اپنی ذات کو تلاش کرنے کی سعی کرنے لگے اور اپنی ذات کے اظہار کی خواہش کرنے لگے۔مصنوعی زندگی میں اصل زندگی کی تلاش نے ہمارے فنکار کو اکسایا اور اس نے علامت اور احتجاج کا راستہ اختیار کیا۔

یہ اثرات اردو ادب کی ہر صنف پر مرتب ہوئے۔نئے شاعروں، افسانہ نگاروں، ادیبوں اور دوسرے لکھاریوں کے ہاں موضوعات اور زبان کی تازگی پیدا ہوئی۔موضوعات میں تو وسعت آئی لیکن زبان نے سادگی اپنالی۔شاعروں نے نیچرل معاشرتی، معاشی اور احتجاجی مضامین اختیار کیے لیکن قدیم عشقیہ مضامین متوازی چلتے رہے۔فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، میرا جی، ن م راشد، مجید امجد، قیوم نظر، شہزاد احمد، ظفر اقبال، شکیب جلالی وغیرہ ایسے شعرا ہیں جنھوں نے فارسی موضوعات کے بجائے ایسے ماحول کو موضوع بنایا ہے جہاں بہار کے ساتھ ساتھ تیز چمکتا ہوا سورج بھی ہے۔جس کی گرمی ہر ذی روح کو جھلسا دیتی ہے۔ان کے موضوعات میں محبت کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کا درد بھی ہے۔

۱۹۳۲ء میں انگارے کی اشاعت سے اردو ادب میں ایک انقلاب آ گیا۔یہ افسانوں کی ایک مختصر سی کتاب تھی لیکن موضوع اور انداز بیان کے لحاظ سے یہ مجموعہ ایک سانحہ تھا جس میں مختلف مصنفین کے افسانے تھے۔یہ افسانے دراصل روایت سے بغاوت تھی۔ان افسانوں میں پرانی اقدار سے نفرت، مذہبی انتہا پسندی کے خلاف احتجاج، معاشی حالات سے تنگ لوگوں کی پریشانی، بے جا پابندیوں کی قید سے آزادی، محبت میں آزادی اور جنسی آزادی شامل تھیں۔ان مصنفین میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں، محمود الظفر کے نام نمایاں ہیں۔ان افسانوں کے منظر عام پر آنے کے بعد ان کے خلاف سخت اور تند و تیز مضامین لکھے گئے۔مصنفین کو سخت نتائج کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ہر طرف سے مخالفت شروع ہوگئی اور آخر کار حکومت نے یہ کتاب ضبط کر لی لیکن انگارے نے اردو ادب کی روایت کا ایک ایسا راستہ متعین کر دیا جس پر نئے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے چلنا شروع کر دیا۔

یہ بات طے ہے پابندیاں یا رکاوٹیں تخلیق کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتیں۔ادیب کسی نہ کسی طرح اپنے خیال کا اظہار کر لیتا ہے پھر یہ روایت بن جاتی ہے۔یہ روایت ہی کسی تہذیب اور معاشرے کو تاریخ کا حصہ بناتی ہے۔کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت بھی کی لیکن ناانصافیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ بھی حقیقت نگاری کے اس چلن سے وابستہ رہے۔ ادب کو ماحول اور زندگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔دنیا کا ہر ادب اپنے عصری حالات کا ترجمان ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ادب برائے ادب کے دعویدار بھی زندگی کی حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کر سکے اور نہ سماج سے دامن چھڑا سکے۔بقول ڈاکٹر اے بی اشرف:

> ادب برائے ادب کے داعیوں کا یہ کہنا کہ ادیب کا کام محض تخلیق حس ہے اور اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل سے اسے کوئی سروکار نہیں یا افادیت کا ادب سے کوئی عمل دخل نہیں، درست نہیں۔ادیب کا کام تخلیق حسن کے ساتھ ساتھ زندگی کے حقائق کی عکاسی کرنا بھی ہے۔ادب، زندگی، معاشرے اور تہذیب کا ترجمان، عکاس اور نفاذ ہوتا ہے۔اسی میں سماجی اور افادی پہلو بھی ہونا چاہیے۔فنی اور جمالیاتی بھی اس کی یہ حقیقت اسے زندگی سے ہم آہنگ کرتی ہے کیوں کہ زندگی بھی انہی دو پہلوؤں سے عبارت ہے۔(۶)

ادیب جو تخلیق کرتا ہے وہ اپنے قاری کے احساسات و جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے کیوں کہ شاعر یا ادیب میں عام انسان سے زیادہ حساس اور شعور کی قوتیں موجود ہیں اس کی قوت مشاہدہ زیادہ تیز ہوتی ہے انسانیت اور فطرت سے اس کو محبت اور ہمدردی زیادہ ہوتی ہے اور وہ زندگی کے مسائل کی اصلاح ذہنی اور معاشی ترقی کی بھی کوشش کرتا ہے ادبی تخلیقات پر عصری حالات اور روزمرہ زندگی کے اثرات تو ضرور ہوتے ہیں لیکن موضوعات کو متعین کرنا ممکن نہیں اگر زندگی کے روپ مختلف ہیں تو ادبی موضوعات بھی متنوع ہوتے ہیں سو ادیب معاشرتی، معاشی، اخلاقی، مذہبی، جنسی، محبت، تعلیم کسی بھی چیز کو موضوع بنا کر تخیل کی آمیزش اور اسلوب کی چاشنی سے اپنی تخلیق کو خوبصورت بنا سکتا ہے۔ترقی پسند ادیبوں نے جب روایت سے بغاوت کی تو معاشرتی موضوعات، سیاست اور فطری جذبات کو زیادہ اہمیت دی۔

اب جب جدید ادب کی بات آتی ہے تو ترقی پسند تحریک اور اس کے بعد حلقہ ارباب ذوق کا خیال ذہن میں ضرور آتا ہے۔ترقی پسندوں نے خارجہ زندگی اور مستقبل کو سنوارنے اور اجتماعیت کے رجحان کو فروغ دیا اور پرانی ادبی روایت کو توڑنے کی کوشش کی وہیں کچھ ذہنوں میں متوازی ایک تحریک ابھری جو حلقہ ارباب ذوق تحریک تھی۔ان دونوں تحریکوں میں داخلیت، خارجیت اور اجتماعت کا فرق ہے۔ترقی پسند خارجیت اور اجتماعت پر زور دیتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید حلقہ ارباب ذوق کی داخلیت، شخصیت اور فرد کو اہمیت دینے کے بارے میں کہتے ہیں:

> .... یہ دونوں تحریکیں قریباً ایک ہی زمانے میں ایک ہی جیسے سماجی اور معاشی حالات میں پیدا ہوئیں پروان چڑھیں اور معنوی طور پر رومانیت کے بطن سے ہی پھوٹی تھیں۔حقیقت نگاری کے امتزاج کی بنا پر ترقی پسند تحریک نے افقی جہت اختیار کی اور اجتماعی عمل کو مادی سطح پر بروئے کار لانے کی کوشش کی۔حلقہ ارباب ذوق نے عمومی جہت اختیار کی اور اس نے اجتماع میں گم ہوجانے کے بجائے ابن آدم کو اپنی شخصیت کے عرفان کی طرف متوجہ کیا۔(۷)

حلقہ ارباب ذوق نے ماضی کی روایت میں جدت کی آمیزش کی زندگی اور اس کے داخل کو اہمیت دی اور ادیب کو کسی خاص موضوع کا پابند نہ کیا یوں اس تحریک نے اردو ادب میں نکھار اور توانائی پیدا کی۔ اس تحریک کی بنیاد ۱۹۳۹ء میں مجلس داستان گویاں کے نام سے ڈالی گئی۔ بعد ازاں اس تحریک میں افسانہ نگاروں سے زیادہ شعرا کی تعداد زیادہ ہوگئی اور میرا جی کی تحریک پر اس کا نام حلقہ ارباب ذوق رکھ دیا گیا۔ حلقے کی یہ خصوصیت نہایت اہم ہے کہ اس نے اردو ادب کو علامت نگاری، وجودیت اور سرئیلزم سے روشناس کرایا۔ حلقہ ارباب ذوق کو زندگی بخشنے والوں میں اہم نام میرا جی کا ہے ان کے علاوہ یوسف ظفر، قیوم نظر، مختار صدیقی اور ضیاء جالندھری وغیرہ نمایاں رہے۔

پاکستان کا قیام اپنے ساتھ بے شمار مسائل لے کر آیا۔ خاص طور پر سیاسی ماحول اور انتشار نے ذہنوں میں بے شمار خدشات اور شکوک پیدا کر دیئے۔ حکومتی سطح پر اختیارات کی تقسیم انتشار کی بنیاد بنی اور کسی بھی حکومت کو استحکام نصیب نہ ہو سکا۔ پے در پے مارشل لاء پھر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگیں۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات، جس سے ملک میں مارشل لاء کا خاتمہ تو ہوا لیکن ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ محبّ وطن لوگ، اہل دانش، ادیب اس سانحے پر خون کے آنسو روئے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں زبان، ثقافت، لباس ہر چیز مختلف تھی سوائے مذہب کے مشرقی پاکستان کے باسیوں کو یہ شکوہ تھا کہ وہ نظر انداز ہو رہے ہیں سو سقوط ڈھاکہ نے ادیبوں اور مصنفین کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ادب کی ہر صنف اس بھونچال کی زد میں آ گئی۔ اس دکھ کے ساتھ جمہوریت کی خوشی بھی شامل تھی۔ لیکن جمہوریت کی یہ گاڑی بھی زیادہ دیر نہ چل سکی اور ۱۹۷۷ء میں ایک مرتبہ پھر مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اس مارشل لا کی بدولت جو حالات پیدا ہوئے ان کے زیر اثر زندگی کے ہر شعبے کے ساتھ ساتھ ادبی سطح پر بھی آمریت کے خلاف مزاحمت ہو لگی۔ نئی نئی علامتیں وضع ہوئیں اور جبریت اور مصائب کا ذکر بھی ہونے لگا۔ ادب میں جدیدیت کی کوئی ایک اور مخصوص وجہ نہ تھی۔

اس سلسلےمیں پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز لکھتی ہیں:

> ترقی پسند تحریک کے خاتمے سے یہ ہوا کہ نظریاتی پس منظر جو اردو ادب میں پختہ ہو گیا تھا اس سے نکلنا آسان ہو گیا۔ نتیجتاً نئے شاعروں اور ادیبوں کے لیے کوئی امر مانع نہیں رہا کہ وہ نئے نظریات کی تلاش کریں اور زبان و بیان کے تجربات سے گریز بھی نہ کریں ایک بات اور جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ نیا سماجی ماحول ہے۔ شہری زندگی کے پھیلاؤ نے بعض پرانی اقدار کو توڑنا شروع کیا اور نئی اقدار پیدا ہونی لگیں۔۔۔۔۔۔۔ جدیدیت کا رجحان تیزی سے پھیلا لیکن نہ ہی یہ حلقہ ارباب ذوق کی طرح کوئی پلیٹ فارم تھا اور نہ ہی ترقی پسند تحریک کی طرح کوئی تحریک تھی۔ (۸)

نئے ادب اور جدیدیت کے رجحان کے تحت معاشرت و سماجی اقدار کی شکست و ریخت، فردیت اور جبر کو موضوع بنایا جانے لگا۔ یہ سب کچھ مغربی ادب کے زیر اثر بھی تھا۔ کیونکہ اس وقت اور اس سے قبل بھی علامت نگاری کی تحریک چل رہی تھی۔ سرئیلزم، ڈاڈاازم، امیجزم، ایمپریشنزم جیسی تحریکیں موجود تھیں۔

جدید ادب کے آغاز کا زمانہ تو ساٹھ کی دہائی ہی ہے۔ ایسی ادبی روایات جو متحدہ ہندوستان میں مشترکہ تہذیبی و نظریاتی پس منظر میں پروان چڑھی تھیں اب نئی نسل نے نئے زاویے اور نظریے تخلیق کرنے شروع کر دیے۔ اس طرح

ایک نیا طرزِ احساس پیدا ہونے لگا۔ ساٹھ کی دہائی میں شعروادب کی زبان میں بنیادی تبدیلیاں پیا ہونی شروع ہوئیں۔ علامت اور استعارہ استعمال ہونے لگے۔

ڈاکٹر رشید امجد اس ضمن میں کہتے ہیں:

> ساٹھ کی دہائی میں موضوعاتی اور فنی دونوں سطحوں پر بڑی تبدیلیاں آئیں سیاسی حالات کی ابتری نے بھی قومی بے سمتی کو جنم دیا۔ چنانچہ ساٹھ کی دہائی میں جو نسل سامنے آئی اس نے خود کو اعلانیہ غیر نظریاتی کہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترقی پسند تحریک کی وجہ خارجی حقیقت نگاری کا جو رجحان پروان چڑھا تھا وہ داخل کی طرف مڑ گیا کردار سائے بن کر بے نام ہوئے اور ٹھوس واقعات بجائے خیال اور آئیڈیا کہانی میں اہم ہوئے۔ شاعری میں بھی جو افسانے کے مقابلے میں داخلی احساسات کی زیادہ ترجمان ہوتی ہے داخلی پسندی گہری ہو کر نفسیاتی دروں بینی اور دوسرے ذات کی تلاش کی محرک ہوئی۔ نئی لسانی تشکیلات استعارہ سازی کا نیا تصور، علامت و تجریدکی بحثیں موضوعات پر حاوی ہوگئیں۔(۹)

یہ بات طے ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی ادیب کو سکون کے لمحات بہت کم نصیب ہوئے۔ حالات کی جلد تبدیلی سیاسی ومعاشرتی بحران، مراعات یافتہ طبقے کے اختیارات غرض ادیب اور شاعر نے ہر حال میں اپنے فرائض کی بجاآوری کی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حالات نے رویے اور زبان میں کڑواہٹ اور سختی ضرور پیدا کی لیکن ادیب نے جمالیاتی قدروں اور فنی لوازمات پر آنچ نہ آنے دی۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان کی اندرونی کیفیات کسی عمل کے لیے محرک ثابت ہوتی ہیں۔ ادیب بھی اپنی سوچوں اور احساس کو قلم کی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادیب جب اپنے احساسات وسوچ پر قلم اٹھاتا ہے تو اس وقت اسے اس کی اہمیت وافادیت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات کی تسکین حاصل کر لیتا ہے اور اپنے وجود کا بیان قلم بند کر کے رکھ دیتا ہے لیکن یہ سب تاریخ کا ایک حوالہ بن کر قارئین کے سامنے آتا ہے۔ کسی دور کے حالات کا جو ادیب کو قلم کاری پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ اس کی ذاتی ضروریات بھی ہو سکتی ہیں، ذہنی تسکین کا باعث بھی۔ ادیب نے سیاست معاشرے، اخلاقیات اور روایات کو مختلف سانچوں میں ڈھالا ہے۔ ادب اور فرد کا براہِ راست رشتہ قائم ہے۔ ایک ادیب کی تخلیق اس کے مشاہدے اور شعور کا خوبصورت امتزاج ہوتا ہے۔ مشاہدہ اور شعور مل کر ادیب کی روحانی مسرت کا سامان پیدا کر دیتے ہیں۔ سو جدید ادب کی تخلیقات نے جہاں فرد کی اندرونی کیفیات اور احساسات کو محفوظ کیا ہے وہاں انھوں نے ایک عہد کے حالات کا بھی جائزہ پیش کر دیا ہے۔ جدید ادب میں جب ناول کا ذکر آتا ہے تو اردو ناول نے ہر دور کی طرح یہاں بھی متنوع موضوعات اپنائے ہیں۔ ''خوشیوں کا باغ'' اور دیوار کے پیچھے دو ایسے اہم ناول ہیں جو اپنے منفرد اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے اردو ناول کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں۔

خوشیوں کا باغ:

''خوشیوں کا باغ'' انور سجاد کا ناول ہے جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا یہ ایک ایسے فرد کی کہانی ہے جو گھٹن کا شکار ہے۔ فرد علامت اور استعارے کا سہارا لے کر اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ انور سجاد نے اس ناول

میں معاشرے میں رواج پانے والی تمام برائیوں کو بے نقاب کیا ہے ایسا معاشرہ جو اپنی روایات اور اقدار کو پس پشت ڈال کر مغربیت کو فروغ دے رہا ہے حسد، منافقت، سیاست، سرمایہ دارانہ رویے، غریب کا استحصال معاشرے میں وبائی بیماری کی طرح پھیل چکا ہے۔ ناول کے بارے میں ڈاکٹر فاروق عثمان اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> بوش کی تصویروں کا تیسرا پینل جس کا نام موسیقی کا جہنم ہے ایک طرح سے فکر کی سطح پر انور سجاد کے لیے صرف تحریک کا باعث بنا ہے اور یہی تحریک اسے گرد و پیش کے حالات کی ایک نئی معنویت تک لے جانے کا باعث ہوئی ہے۔ بلا شبہ ہماری ادبی روایت میں کہانی کار کا رواجی سانچوں سے بالکل ہٹا ہوا رویہ ناول ہے ناول بظاہر تگر بیت خبروں اور بیانات، واقعات کا ایک مجموعہ جو کسی مربوط کہانی کو شعوری طور پر سامنے نہیں لاتے لیکن یہ سارے مناظر اور مظاہر مل جل کر ایک مکمل موضوع موڈ اور کیفیت کی سطح پر ہمارے جسم و جان میں اتارتے چلے جاتے ہیں۔ (۱۰)

''خوشیوں کا باغ'' کے اسلوب و بیان میں شعری وسائل سے کام لیا گیا ہے۔ اس کہانی میں ''میں'' مرکزی کردار ہے جس کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے۔ ''میں'' معاشرے کا ایسا فرد ہے جو مسلسل تناؤ کا شکار ہے۔ یہ کہانی کسی ایک مخصوص عہد یا علاقے کے لیے مخصوص نہیں۔ ''میں'' تیسری دنیا کا ایک ایسا فرد ہے جو اپنے حقوق کا ادراک رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ مشینی دنیا کے رہنے والے لوگ معاشرے کے ایک عام فرد کو کیسے اپنے سرمائے کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ تیسری دنیا میں جمہوریت کے پودے کو بار بار کاٹ دینا، فوجی آمریت اور مذہب کے نام پر عوام کو دھوکا دینا ایک روایت بن چکا ہے اقتدار اور دولت کی ہوس نے ایک مخصوص طبقے کو پاگل کر دیا ہے جبکہ غریب اپنی محدود خواہشات کو پورا کرنے کے لیے سرگرداں ہے اور ان کی تکمیل پر مطمئن ہو جاتا ہے ایسے معاشرے میں ادیب یا مصنف کھل کر بات کرنے سے گھبراتا ہے ایسے میں علامت اس کا واحد سہارا ہے جس سے وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتا ہے جبکہ عوام بے حس ہیں اگر وہ متحد ہو کر اپنے حق کی جنگ لڑے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اس کے سامنے گھٹنے ٹیک سکتی ہے۔ ''خوشیوں کا باغ'' کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> انور سجاد نے اپنے پاکستانی معاشرے کے ساتھ ساتھ پوری تیسری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ''خوشیوں کا باغ'' کا موضوع انہی ناانصافیوں اور ظلم و ستم سے ترتیب پاتا ہے اور ناول کے ہیرو چیف اکاؤنٹنٹ کے ذریعے پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اپنے کرم خوردہ استحصالی نظام کی تبدیلی پر قادر نہیں۔ اس لیے کہ اب بیرونی جبر نے انہیں مفلوج کر کے رکھ دیا ہے وہ کوئی ایسی پالیسی نہیں اپنا سکتے جس میں ان کے یہاں آزادی اور آسودگی کا سورج طلوع ہو جائے۔ (۱۱)

دولت کی ہوس اور اقتدار کے نشے نے غروب کو محکوم، مظلوم لوگوں کو جکڑ رکھا ہے اس طبقے کو ان ظالمانہ کارروائیوں اور غریب عوام کو دبا کر رکھنے میں ہی تحفظ محسوس ہوتا ہے وہ اپنے مفاد کی خاطر قانون کو ہمیشہ اپنی گرفت میں رکھتے ہیں اگر اہل زر اور صاحب اقتدار کے خلاف کوئی بات کی جائے تو بات کرنے والے کو سلاخوں کے پیچھے قید کر دیا جاتا ہے یا پھر

ان کی کھال کھنچوادی جاتی ہے۔انکم ٹیکس کے گوشواروں میں غلطی چیف اکاؤنٹنٹ کوملازمت سے برطرف کروادیتی ہے۔اسے ایک سال قید ہوجاتی ہے۔

انور سجاد نے ایک ہی سانس میں معاشرے کی برائیوں کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ اپنے عہد کی تمام سماجی برائیوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے ان برائیوں کے وجود سے کسی کو انکار نہیں انور سجاد نے کوئی پہلو تہی نہیں کی بلکہ ان کا برملا اظہار کر دیا ہے۔

زبان مشکل استعمال کی گئی ہے اور اسلوب عام قاری کی ذہنی سطح سے بلند ہے۔اس ناول کو سمجھنے کے لیے بوش کی پینٹنگ کو دیکھنا اور سمجھنا اور مصنف کے تصورات کی کڑیوں کو ملانا نہایت ضروری ہے اور یہ کام صرف ان اصحاب و ناقدین کا ہوسکتا ہے جو بوش کی تصاویر اور مصنف کی ذہنی سطح سے واقف ہوں۔

حقیقت اور سچائی کو ملحوظ رکھ کر یہ ناول تحریر کیا گیا ہے جس میں انھوں نے اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کی ہے۔سچ بولنے اور اسے سہہ لینے کے لیے بہت بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔جدید ادب میں تمام پابندیوں کے باوجود علامتوں کے ذریعے مصنفین نے سچائی کا دمان ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

دیوار کے پیچھے:

جدید ادب کا تعلق براہ راست زندگی اور معاشرتی حالات سے جڑا ہوا ہے۔بلکہ یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ ادب میں زندگی کی عکاسی جدید ادب کی روح ہے۔جدید ادب کے حوالسے سے جن ناول نگاروں کی بات کی جارہی ہے ان میں انیس ناگی کا نام قابل ذکر ہے۔ان کا ناول ''دیوار کے پیچھے'' جدید ادب کی عکاسی کرتا ہے۔اپنے نام کی مناسبت سے اس ناول کا موضوع عوام کا تعاقب کرنے والی ان معاشرت برائیوں،استحصال، جاگیردا اور سرمایہ دار طبقے کی اجارہ داری ہے۔پردوں کے پیچھے اور بند دروازوں کے اندر ایسی منصوبہ بندیاں کی جاتی ہیں جن کی بدولت بڑے طبقے کو فائدہ ہو، بے شک عوام کے منہ سے نوالہ اور پل بھر کا سکون بھی چھن جائے۔

انیس ناگی ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے لسانی تشکیلات کے تجربات کیے یہ بنیادی طور پر جدت پسند ہیں۔ انیس ناگی،انور سجاد وغیرہ سارتر کے فلسفہ وجودیت سے بہت متاثر تھے۔انیس ناگی نے جب شاعری شروع کی تو اس وقت بھی ان کی شاعری پر وجودیت کے اثرات موجود تھے۔ان کی شاعری کا دور ایوب خان کے مارشل لاء کا دور تھا اور جب انھوں نے''دیوار کے پیچھے'' لکھا تو یہ دور ضیاءالحق کے مارشل لاء کا دور تھا۔یہ آمریت کے دور تھے اور ان ادوار میں اظہار پر پابندیاں عائد تھیں۔حساس فنکار اپنے بیان کو علامت اور وجودیت کے لبادے میں محفوظ کرنے پر مجبور ہوگئے۔ جبر آمریتوں کا پیدا کردہ ہے۔ناول کا ہیرو اس جبر و تشدد کو محسوس کرتا ہے کیونکہ ماحول پر تشدد ہے وہ جس معاشرے میں رہ رہا ہے وہاں اظہار پر پابندی، جھوٹ منافقت، بددیانتی کا بازار گرم ہے، وہ سچ بولنا چاہتا ہے، آزاد ہونا چاہتا ہے لیکن اس طرح کے معاشروں میں خود کو آزادی نہیں مل سکتی۔

''دیوار کے پیچھے'' ایک جدید ناول ہے۔ناول لکھنے کا فن یوں تو عام تھا اور روایتی بھی تھا جس میں کہانی کا آغاز، وسط اور انجام لازمی تھا جو عام روایت کے مطابق تھا لیکن جب مغربی ادب کے اثرات ہمارے فکشن نگاروں پر پڑنے لگے تو ناولوں میں بھی جدت پیدا ہوگئی۔بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خان:

جب ان کا ناول دیوار کے پیچھے منظر عام پر آیا تو راتوں رات قابل ذکر ناول نگار بن گئے۔
قابل ذکر اس لیے کہ انھوں نے اس صنف ادب کے سلسلے میں روایت سے کافی حد تک انحراف
کیا اور جب نئی روایت کا آغاز کسی باصلاحت فنکار کے ہاتھ میں ہو اور فن پارہ اپنی حیثیت منوا
لے تو ایسے ادیب کا قابل ذکر سمجھنا از بس ضروری ٹھہرتا ہے۔(۱۲)

اس ناول میں ہیرو کا دوست اس کی کہانی بیان کرتا ہے لیکن یہاں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ کہانی پڑھ نہیں رہا بلکہ ایک فرد پر بیتنے والے تمام حالات اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات کو نفسیاتی انداز سے بھی بیان کر رہا ہے۔ پروفیسر احمد جاوید کے الفاظ میں یہ ناول وجدی بھی ہے اور نفسیاتی بھی۔

ناول میں ایک ایسے پروفیسر کی کہانی بیان کی گئی ہے جو لاپتہ ہے اور اس کا دوست احمد اس کے حالات بیان کر رہا ہے۔ پروفیسر اس کے نام ایک خط چھوڑتا ہے اور اپنے حالات کا ایک کاغذی پلندہ بھی اس کے لیے چھوڑ جاتا ہے لیکن حالات اسے خاموش رہنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے معاشرے کا فرد ہے جہاں سچ اور انصاف صرف زبانی کلامی ہوتا ہے، عملی طور پر اس کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ منافقت اور ریاکاری زیادہ ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہ بہت بڑا المیہ ہے جس سے کسی کو انکار نہیں۔ انیس ناگی نے معاشرتی حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ سچ بولا نہیں جاتا اور جو بولنا چاہتا ہے اس کا راستہ روک دیا جاتا ہے۔

مارشل لاء کی سختی، معاشی تنگدستی، فرسودہ نظام، عدل، کرپشن اس ناول کا اصول موضوع ہے انیس ناگی نے متوسط طبقے کے ایک پروفیسر کی کہانی اس کے دوست کی زبانی بیان کی ہے عصری حالات کے ایک پسماندہ شخص کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں اور وہ ان حالات سے نبرد آزما ہونے کی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔''دیوار کے پیچھے'' ایک ایسا ناول ہے جو نفسیاتی کشمکش کی منہ بولتی تصویر ہے۔ تجرباتی طور پر لکھنے جانے والے اس ناول میں اگرچہ اندر سے ایک فرسودہ اور بددیانت عدالتی نظام کو استعارہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جھوٹے گواہ اور جھوٹی گواہیاں ہی تو پاکستانی نظام عدل کو کوکھلا کر چکی ہیں۔

جدید ادب کے تحت لکھے جانے والے ان ناولوں سے پتا چلتا ہے کہ ناول ہمیشہ معاشرے کے حالات سے متاثر ہو کر ہی لکھا جاتا ہے۔ ادیب اور شاعر معاشرے کے نبض شناس ہوتے ہیں۔ اپنے اردگرد ہونے والی سیاسی و معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کو باقی لوگوں کی نسبت زیادہ محسوس کرتے ہیں اور اپنی تخلیقات کے ذریعے ظلم وستم اور ناانصافی کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتے ہیں۔ پروفیسر اور اس طرح کے دوسرے افراد بالآخر حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ معاشرے اور حالات کو اپنے باطن پر حاوی جان کر خارجی طور پر تو ایک کٹھ پتلی بن جاتے ہیں لیکن باطنی طور پر وہ ان عوام کو قبول نہیں کرتے۔

حوالہ جات

۱۔ عتیق احمد،''ہمارے ادب کے جدید رجحانات''،مشمولہ''پاکستانی ادب تنقید''، پانچویں جلد، ترتیب وانتخاب: رشید امجد، فاروق علی، ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۶۲۳۔۶۲۴
۲۔ حنیف فوق، ڈاکٹر،''اردو ادب میں ترقی پسند تحریک''، مشمولہ''پاکستانی ادب''، پانچویں جلد، ترتیب وانتخاب:

رشید

امجد، فاروق علی، ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۳۶۷

۳۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات'' مکتبہ عالیہ بازار، لاہور، باراول، ۱۹۹۰ء، باردوم ۱۹۹۹ء، ص ۲۴۶

۴۔ چوہدری محمد اشرف، ''ادیب اور اس کا عہد''، مشمولہ ''پاکستانی ادب'' پہلی جلد، ترتیب وانتخاب: ڈاکٹر رشید امجد، فاروق علی، ایس ٹی پرنٹرز دریا آباد، راولپنڈی، مئی ۱۹۸۱ء، ص ۵۳۲

۵۔ عتیق احمد، ''ہمارے ادب کے جدید رجحانات''، مشمولہ 'پاکستانی ادب''، پانچویں جلد، ترتیب وانتخاب: رشید امجد، فاروق علی، ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۶۳۰

۶۔ اے بی اشرف، ''ادب اور زندگی کا باہمی رشتہ''، مشمولہ 'پاکستانی ادب''، پانچویں جلد، ترتیب وانتخاب: رشید امجد،

فاروق علی، ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۳۵۱

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تحریکیں''، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت چہارم، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳۷

۸۔ پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تحریکیں''، بشمولہ اردو تنقید میں پاکستانی تصور قومیت'' مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص

۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ''پاکستانی ادب کے نمایاں رجحانات''، مشمولہ: ''پاکستان میں اردو ادب کی پچاس سال''، مرتب:

ڈاکٹر نوازش علی، ششر کت پرنٹنگ پریس، لاہور، اشاعت دوم، ۲۰۰۲ء، ص ۱۹ تا ۲۰

۱۰ فاروق عثمان، ڈاکٹر، ''اردو ناول میں مسلم ثقافت''، بیکن بکس ملتان، باراول، ۲۰۰۲ء ص ۳۳۰

۱۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، ''مضمون: جدید اردو ناول میں موضوعاتی تنوع (پاکستان کے حوالے سے)'' مشمولہ، ''پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال''، مرتب: ڈاکٹر نوازش علی، گندھارا، راولپنڈی، باردوم، ۲۰۰۲ء ص ۳۳۷

۱۲۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، ''اردو ناول کے بدلتے تناظر''، ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی، باراول، ۱۹۹۳ء، ص ۲۹۳